تہذیبی انحطاط اور اخبارات

فاروق عادل

ABSTRACT:

The study aims to determine the correlation between the employment of language and the decay of the Normative framework and degeneration of societal norms. It has been seen that irresponsible statements for politicking are generally picked up and hyped by the media. Further, the degradation of language and personal allegations put politics away from partisan political domain resulting into desensitisation of the society. This correlation of lousy language and desensitisation of the society has not been studied theoretically in Pakistan. The assessment, in this study, has been carried out in light of the parameters set out by the Theory of Desensitisation under a larger framework of General Agression Theory delineating that abnormal shifts to neo-normal if repeated with regular intervals. The study confines to two watershed years i.e, 1958 when Pakistan faced first constitutional breakdown and 2013 onwards resulting into polarisation. In order to analyse, a widely read newspaper selected that have been in circulation virtually all over Pakistan since its creation. The editorials, statements of political leaders, reporting of incidents have been studied precisely that determined the course of the political history of Pakistan and the fissures in the social texture of the country. It has been observed that the more such content is given coverage, the more society and polity gets desensitised. Moreover, publication of such content is incremental in nature, that is to say, it expands in terms of coverage and intensity as time goes by. The study concludes that desensitization has been growing over the years resulting into degeneration of the societal norms

and values.

Key Words:

Cultural degeneration, Media, Degradation of language, Theory of Desensitisation, Aggression, Politics.

زبان کے غیر محتاط استعمال، حفظ مراتب سے بے نیازی اور معاشرتی مقدسات کو روند ڈالنے جیسے عوامل اجتماعی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں، اس پر گہرے غور وفکر کی ضرورت ہے۔تاریخ اور تہذیب وتمدن کے اوّلیں فلسفی ابن خلدون کہتے ہیں کہ جو اقوام مکارم اخلاق سے محروم ہو جاتی ہیں یا ان میں اخلاق ذمیمہ پیدا اور رذیل عادتیں راسخ ہو جاتی ہیں، قدرت ان سے اقتدار و اختیار چھین لیتی ہے[۱]۔ڈاکٹر بشارت علی نے انسانی سماج میں اس قسم کی ٹوٹ پھوٹ اور اس کے نتائج کا ابن خلدون کے افکار کی روشنی میں تجزیہ کیا ہے جس کے مطابق اگر اخلاق حسنہ کی پیروی کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو اس کے نتیجے میں نظمِ اجتماعی درہم برہم ہو جاتا ہے جو معاشرے کے تنزل کا باعث بنتا ہے اور اسے وجود سے عدم کی طرف گامزن کر دیتا ہے[۲]۔

سماج کو بلندی سے پستی میں گرا دینے والے اِن رجحانات کی نشر و اشاعت کا بنیادی ذریعہ کیا ہے؟ زبان و بیان اور سماجی زندگی سے اس کے ارتباط کی بنیادوں پر ٹھوس کام کرنے والے محققین کا خیال ہے کہ یہ زبان ہی ہے جو انسانی سماج کے ہیکلِ اجتماعی میں روح بن کر تعامل کی صورت پیدا کرتی ہے، جس کے نتیجے میں تہذیبی روّیے، ثقافتی اقدار اور علمی سرگرمی فروغ پاتی ہے[۳]۔سماج کو ترقی اور سربلندی کی طرف لے جانے والی یہ سرگرمی ظاہر ہے زبان کے مثبت اور حکیمانہ استعمال کے نتیجے ہی میں ظہور پذیر ہوتی ہے۔اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو معاشرہ فتنہ و فساد سے بھر جائے گا، قرآنِ حکیم نے اس عمل کو قتل سے بھی زیادہ سنگین قرار دیا ہے[۴]۔جب کہ سورۃ الحجرات میں ارشاد ہوا:

> ''نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں ، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو''[۵]۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ زبان و بیان کی مثبت سرگرمی معاشرے کو ترقی اور سربلندی سے ہم کنار کرتی ہے جب کہ اس کے برعکس طرزِ عمل سماج کو اُس انجام سے دوچار کر دیتا ہے جس کی طرف ابن خلدون نے اشارہ کیا ہے۔انحطاط کا یہ عمل افرادِ معاشرہ پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے؟ ماہرین عمرانیات نے اس پر کام کیا ہے جو جارحیت کے عمومی ماڈل(General Aggression Model)کے تحت وجود میں آنے والے نظریۂ انحطاطِ حساسیت(Theory of Desensitization) کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ اس نظریے کے مطابق جارحانہ یا ناپسندیدہ نوعیت کے پیغامات یا مواد اگر تسلسل کے ساتھ لوگوں تک پہنچتے رہیں تو اس کے نتیجے میں اِن

روّیوں کے بارے میں عوام کی حساسیت میں بہ تدریج کمی واقع ہوتی جائے گی اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب افرادِ معاشرہ کی ایک بڑی تعداد خود اسی قسم کا طرزِ عمل بغیر کسی معذرت یا شرمندگی کے اختیار کر لے گی[۶] یعنی اس منفی سرگرمی کے نتیجے میں معاشرہ انحطاط کا شکار رہو جائے گا۔

انسانی معاشرے کے درمیان ربط اور اطلاعات کے حصول کا بنیادی ذریعہ اگر چہ اس جدید عہد میں بھی رو در رو ابلاغ (Face to Face Communication) ہی ہے لیکن ذرائع ابلاغ کی ترقی اور ان کی مختلف صورتوں نے انسانی معاشرے پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں جن کی ابتدائی صورت تو تقریر اور منادی وغیرہ کی شکل میں تھی لیکن بعد کے زمانوں میں اخبارات نے ان کی قائم مقامی حاصل کی جو ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے ہوتے ہوئے انٹرنیٹ کے عہد میں ویب سائٹس اور سماجی رابطے کے مختلف پلیٹ فارموں کی شکل اختیار کر گئے۔ اطلاعات کی فراہمی اور افراد معاشرہ کے درمیان رابطے کے ان ذرائع کے اثرات پر کام کرنے والے ماہرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ابلاغ کے بدلتے اور ترقی کرتے ہوئے ان ذرائع نے لوگوں کی عادات و اطوار حتیٰ کہ طرزِ گفت گو کو بھی بڑی حد تک تبدیل کر دیا ہے۔ پاکستان کے سیاسی ماحول میں اکثر اوقات جو تلخی اور بدصورتی محسوس کی جاتی ہے، اس کے بارے میں بھی عمومی خیال یہی ہے کہ اس میں ابلاغ کے ان ذرائع نے اتنا ہی حصہ ڈالا ہے جتنے یہ طاقت ور اور مؤثر ہیں لیکن کیا اس تاثر کے حق میں کچھ ایسے ٹھوس ثبوت بھی دستیاب ہیں جو اس تاثر کی تائید میں پیش کیے جا سکیں؟

پاکستانی معاشرے، حتیٰ کہ اس سے ملتے جلتے دیگر معاشروں میں بھی ذرائع ابلاغ عامہ کے توسط سے افرادِ معاشرہ تک پہنچنے والے پیغامات کی مختلف صورتوں پر کام ہوا ہے لیکن ان کی نوعیت مختلف قسم کی ہے۔

مثال کے طور پر بعض مصنفین نے خود کو زرد صحافت (Yellow Journalism) تک محدود کیا ہے، ذرائع ابلاغ عامہ کا حصہ بننے والے ایسے مندرجات جو اخلاق کے معیار سے نیچے جا گریں، وہ یقیناً زرد صحافت کے زمرے ہی میں شمار کیے جائیں گے۔ یوروپیئن جرنلزم سنٹر نے اپنی ایک رپورٹ میں قرار دیا کہ بدعنوان صحافیوں کی طرف سے قومی مفادات سے تعلق رکھنے والے معاملات کا غلط مقاصد کے لیے استعمال زرد صحافت کے زمرے میں آتا ہے۔ اس طرزِ عمل کے نتیجے میں قومی صحافت میں سنسنی خیزی اور بدعنوانی اور رشوت ستانی کا فروغ بھی زرد صحافت ہی کی وجہ سے ہے[۷]۔

زرد صحافت کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس کے ذمہ داران سنسنی خیزی کے ذریعے صارفین کو متوجہ کر کے اپنی آمدن میں اضافہ کرتے ہیں۔ اِس مکتبۂ فکر کے مطابق ایسی صحافت کی گنجائش خود اس کے صارفین ہی پیدا کرتے ہیں جو اپنے تجسس اور زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش میں اس طرح کا مواد پیش کرنے والے صحافتی اداروں کی حوصلہ افزائی کے مرتکب ہوتے ہیں، یوں صحافت کا معیار متاثر ہوتا ہے کیوں کہ ایسی صحافت اپنے صارفین کی آڑ میں مختلف معاملات زندگی کو ان کی اصل شکل میں پیش کرنے کے بہ جائے انھیں اپنی مرضی کے رنگ میں پیش کرتی ہے[۸]۔

زرد صحافت کے رجحان کا غیر تصدیق شدہ خبروں کی اشاعت کے تناظر میں بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ چین کی ایک جامعہ کی تحقیق کے مطابق پاکستان میں انگریزی کے ایک اخبار کو چھوڑ کر پوری اخباری صنعت، خاص طور پر ٹیلی ویژن نیوز چینلز غیر تصدیق شدہ خبروں کی اشاعت کے عارضے میں مبتلا ہیں جس کی وجہ سے ملک میں معروضی صحافت قریب قریب دم توڑ چکی ہے۔ یہ ایک ایسی صورت حال ہے جس میں جلد یا بہ دیر اس ملک کی صحافت آزادی سے محرومی کے صدمے سے دوچار ہوسکتی ہے۹۔

زرد صحافت اور اس اثرات کے جائزے پر مشتمل لٹریچر میں مجرد آزادیِ صحافت کے بحران یا پابندیوں کی صورت میں جمہوری آزادیوں کو پہنچنے والے نقصانات کا ذکر تو کثرت سے ملتا ہے لیکن یہ پہلو ابھی تک توجہ سے محروم ہے کہ جب صحافت معروضی رپورٹنگ یا آزادیِ اظہار سے مستفید ہوکر اخلاقی حدود کو پھلانگ جائے تو معاشرے پر اس کے اثرات کی نوعیت کیا ہوگی؟ دوم یہ کہ صحافت میں ایسے کون سے رجحانات پائے جاتے ہیں جو اخلاقی معیار پر پورے نہیں اترتے، جن کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ یہ معاشرتی اقدار کے لیے ضرر رساں ہیں؟ اس کا تعین صحافتی مندرجات کے تجزیے کے ذریعے تاحال نہیں کیا جاسکا۔ گزشتہ صدی کی ساتویں دہائی میں امریکی صدارتی انتخابات کے لیے چلائی جانے والی مہمات کے اثرات کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کے لیے جو تحقیق کی گئی، وہ اس معاملے میں استثنائی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تحقیق میں یہ دریافت کیا گیا کہ ذرائع ابلاغ کے واسطے سے جو پیغامات مخاطبین تک پہنچائے جاتے ہیں، ان کے اثرات صرف اتنے ہی نہیں ہوتے جو مقصود ہوں بلکہ اس کے سوا بھی ہوتے ہیں۔ یعنی وہ از خود بھی کچھ ایسا تاثر ضرور چھوڑ جاتے ہیں جن کے نتیجے میں افراد معاشرہ میں کسی قسم کی بے چینی یا بے اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے۔ منفی نوعیت کے یہ اثرات اس منفی پروپیگنڈے کے نتیجے میں آپ سے آپ پیدا ہو جاتے ہیں اور عوام کی سیاسی نظام، اداروں اور شخصیات سے بے زاری کا باعث بن جاتے ہیں۱۰۔ امریکی محقق کرٹ لینگ (Kurt Lang) اور ان کی اہلیہ گلیڈی اینگل لینگ (Glady Engel Lang) کے اس کام کو نظریۂ ابلاغی اضطراب (Media Malaise Theory) کا نام دیا گیا۔ آنے والے برسوں میں اس نظریے پر بہت کام ہوا۔ بہت سے محققین نے تنقید کرکے یہ نظریہ مسترد کردیا۔ اس نظریے کے نقادوں میں پیپا نورس (Pippa Norris) خاص طور پر قابل ذکر ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک کسی باخبر مخاطب کا گمراہ ہو جانا قرینِ حقیقت نہیں ہوسکتا ۱۱۔ کینتھ نیوٹن (Kenth Newton) نے یہی بات زیادہ دوٹوک الفاظ میں کہی کہ ذرائع ابلاغ عوام کو سیاسی عمل سے جوڑتے ہیں، علیحدہ نہیں کرتے ۱۲۔ اس طرح کی تنقید کے باوجود ابلاغی اضطراب کے بنیادی نظریے پر بہت سے محققین نے کام جاری رکھا اور مختلف پہلوؤں سے اس میں کئی اضافے کیے لیکن اخلاقی اثرات کے تعلق سے جن لوگوں نے کام کیا، ان میں جان کلینے جین ہوئیس (Jan Kleinnijenhuis)، ڈرک اوجیما (Dirk Oegema) اور انیتا وان ہوف (Anita van Hoof) قابل ذکر ہیں۔ انھوں الزام تراشی، جوابی ردِعمل اور مخالفین کو تنقید کا نشانہ بنانے کے اثرات پر توجہ دی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ذرائع ابلاغ میں اس نوعیت کا مواد ابلاغی اضطراب کا باعث بنتا ہے ۱۳۔ بعد والوں نے اس موضوع پر جو کام کیا، وہ اُس انداز فکر سے زیادہ

قریب تھا جو اخلاقی انحطاط کو معاشرے کی تباہی کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ ان محققین میں ڈائنا سی مز (Diana C. Mutz) اور بائرن ری ویس (Byron Reeves) شامل ہیں جو اس نتیجے پر پہنچے کہ اختلافات اور تصادم کی شدت اخلاقی حدود کو پامال کر کے بدتمیزی کے دائرے میں شامل ہو جائے تو اس کے نتیجے میں سیاسی بحران پیدا ہو جاتا ہے[۱۴]۔ جیمز میک روسکی (James C McCroskey) اور لارنس آر وی لیس (Lawrence R. Wheeless) نے معاملے کے اسی پہلو پر مزید کام کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ الزام تراشی، جوابی الزام تراشی اور تصادم جیسی کیفیات رکھنے والے مواد کے نتیجے میں سیاسی بحران پیدا نہیں ہوتا بلکہ معاشرتی ہم آہنگی کو بھی صدمہ پہنچتا ہے۔ یہ کیفیات سیاست داں اور ریاستی اداروں کے درمیان دوری پیدا کرنے اور ان کی ساکھ کے خاتمے کا موجب بھی بن جاتی ہیں[۱۵]۔

اس نظریے کے مختلف پہلوؤں میں تصادم، الزام تراشی اور بدتمیزی جیسے اثرات رکھنے والے مواد کے سیاسی اثرات زیر بحث لائے گئے لیکن اخلاقی طور پر معیوب طرز عمل آخر معاشرے کے تہذیبی اور اخلاقی پہلوؤں پر بھی کچھ نہ کچھ اثر انداز ہوتا ہو گا۔ عمرانیات کا نظریۂ انحطاطِ حساسیت (Theory of Desensitization) اس سلسلے میں راہ نمائی کرتا ہے جس کے مطابق کوئی معیوب عمل اگر تکرار سے کیا جاتا رہے تو اس کے نتیجے میں وہ عمل لوگوں کی نگاہ میں معیوب نہیں رہتا اور رفتہ رفتہ لوگوں میں اس کے بارے میں حساسیت کم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے اور وہ اسے اختیار کرنے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے[۱۶]۔ اس سلسلے میں نظریۂ ابلاغی اضطراب وہ بنیادیں فراہم کرتا ہے جس کی مدد سے ایسے صحافتی مواد کی نشان دہی کی جا سکے جو مسلمہ اخلاقی اقدار کے منافی ہو۔ ایسے مواد کی نشان دہی کرنے کے بعد نظریۂ انحطاطِ حساسیت کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا ممکن ہو جائے گا کہ اس نوعیت کے صحافتی مندرجات کا کوئی حصہ کس طرح اخلاقی اور تہذیبی انحطاط کا باعث بنتا ہے۔

ذرائع ابلاغ یا خاص طور پر اخبارات کے مندرجات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا مواد جس پر یہ حکم لگایا جا سکے کہ وہ مسلمہ اخلاقی معیارات پر پورا نہیں اترتا، اس کا بیشتر حصہ سیاسی شخصیات کی تقاریر اور بیانات میں پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تجزیہ و تبصرہ میں بھی اس کی کافی گنجائش ہوتی ہے۔ سیاسی مہم جوئی اور محاذ آرائی کے دوران میں جذبات کی شدت عروج پر جا پہنچتی ہے، ایسے مواقع پر جس قسم کا صحافتی مواد جنم لیتا ہے، اس میں بھی ایسی کیفیات کا پایا جانا بعید از قیاس نہیں، لہٰذا اس مطالعے کے لیے اخبار میں شامل اس تمام قسم کے مواد کا تجزیہ کیا گیا ہے جس کا کسی بھی نوعیت کی سیاسی سرگرمی سے کوئی تعلق رہا ہے۔ اس تجزیے کے لیے درج ذیل تاثر رکھنے والے مواد کو بہ طور پیمانہ مقرر کیا گیا:

۱۔ الزامات اور جوابی الزامات

۲۔ ایسا مواد جس میں اخلاقی حدود سے تجاوز کیا گیا ہو، مخالفین کے نام بگاڑنا، انھیں غدار، ملک دشمن، بد دیانت اور خائن قرار دینا

۳۔ تصادم کی کیفیات جن میں مار پیٹ، تشدد، پکڑ دھکڑ اور گرفتاری وغیرہ شامل ہو، کیوں کہ اس قسم کی صورت

حال کشیدگی اور الزام تراشی کے نتیجے میں ظہور میں آتی ہے اور مستقبل میں اس کے مزید دروازے کھولتی ہے۔

سیاسی ماحول ہو یا صحافت کا منظر نامہ، لحاظ، مروت اور تہذیبی رکھ رکھاؤ کے معاملے میں موجودہ دور (سال ۲۰۲۰ء اور اس کے قرب وجوار کے زمانے) کو ایک بری مثال کے طور پر یاد رکھا جائے گا جس کا اعتراف اہل سیاست وصحافت کی طرف سے مختلف پلیٹ فارموں پر ہوتا رہتا ہے۔ اس طرز عمل کی کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن کیا یہ رجحان آپ سے آپ اور اچانک ہی راہ پا گیا یا اس کی جڑیں تاریخ میں پیوست ہیں؟ اس کا اندازہ پاکستان کے ابتدائی ادوار کی صحافت کے تجزیے سے ممکن ہے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ۱۹۵۸ء کا سال بہت ہنگامہ خیز ہے۔اس زمانے میں بہت سے سیاسی مناقشات ہوئے ، ہنگامہ خیزی ہوئی اور ملک میں بالآخر مارشل لا کے نفاذ کی نوبت آ گئی۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ تجزیہ مشتملات کے لیے قرعہ اندازی کے ذریعے سال ۱۹۵۸ء اور اس کا مہینہ اپریل منتخب ہوا جس میں اسی سال کے دیگر مہینوں کی نسبت زیادہ ہنگامہ خیزی نہیں تھی لیکن عمومی طور پر متحرک سیاسی ماحول تھا جس کے سبب سیاسی تلخی میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا جاتا تھا، اخباری مندرجات میں بھی اسی حساب سے تلخی بڑھتی جاتی تھی۔

جولائی ۱۹۵۸ء کے نوائے وقت کے مندرجات کا جائزہ اس دور کی سیاست، سیاسی روّیوں اور سیاسی اخلاق کو سمجھنے میں ہی مدد فراہم نہیں کرتا بلکہ اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ جب ملک کسی سیاسی بحران یا ایک ہی وقت میں مختلف قسم کی سیاسی مہم جوئی کا شکار ہوتا ہے تو معاشرے کے دیگر اداروں کی طرح صحافت بھی اس کا اثر قبول کیے بغیر نہیں رہتی اور اس کے مندرجات کا درجۂ حرارت ہی نہیں بلکہ ان کے مصنفین کی جذباتی کیفیات بھی حالات کے دھارے کے ساتھ بہتی چلی جاتی ہیں، اس طرح معروضیت جو صحافت کا بنیادی وظیفہ ہے، صحافی کے قلم اٹھاتے ہی مجروح ہو جاتا ہے۔ جولائی ۱۹۵۸ء کے اخباری مندرجات کی کیفیات بھی ایسی ہی ہیں۔

خبر کے حصول کے لیے الیکٹرانک میڈیم اور اس کے بعد سماجی رابطے کی ویب سائٹس کے مقبول ہونے سے قبل اس معاشرتی ضرورت کی تکمیل کا سب سے بڑا ذریعہ اخبار ہی تھا۔ اس تجزیۂ مشتملات میں سیاسی سرگرمی سے متعلقہ تمام اخباری مندرجات اور اس کی مختلف اصناف کو شامل رکھا گیا ہے جن میں خبر، اداریہ، مضمون اور کالم کے علاوہ ایڈیٹر کے نام خط شامل ہیں۔ اخبار کے قاری کا واسطہ چوں کہ سب سے پہلے خبر سے پڑتا ہے، اس لیے تجزیے کی ابتدا میں اس پر توجہ بامعنی ہوگی۔

خبری مواد :

صحافیوں کے ہاں خبر کو کئی اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے لیکن چوں کہ اس تجزیے میں سیاسی سرگرمی توجہ کا مرکز بنائی گئی، اس لیے یہاں خبر کی دو اقسام زیر بحث آئیں، اوّل اخباری بیان یا تقریر جو سیاسی سرگرمی کو بنیاد فراہم کرتی ہے اور دوم واقعاتی خبر جو کسی سیاسی سرگرمی یا اس سرگرمی کے ردعمل میں رونما ہونے والے واقعات کی روداد بیان

کرتی ہے۔

بیان اور تقریر:

اخباری مواد میں شامل بیانات اور تقاریر وہ بنیادی چیزیں ہیں جن کے ذریعے سیاسی قائدین اور معاشرے کے دیگر اہم افراد اور رائے ساز شخصیات کی آرا اور مافی الضمیر قارئین اور عوام کے سامنے آتا ہے۔ اخباری اصناف میں شامل یہ صنف اس اعتبار سے نمایاں ہے کہ اس میں اخباری عملے یا مدیران کے پاس چھیڑ چھاڑ یا الفاظ کی تبدیلی کی گنجائش کم سے کم ہوتی ہے، یوں یہ صنف بالعموم بلاکم وکاست قاری تک پہنچ جاتی ہے۔ اس جائزے سے معلوم ہوا کہ اخباری اصناف میں شامل بیان یا تقریر کی خبر وہ صنف ہے جس میں کہنے والے کے پاس اپنے مخالفین کے بارے میں کوئی غلط بات کہنے اور اس کے لیے رکیک الفاظ کے استعمال کی گنجائش کافی ہوتی ہے۔

زیر جائزہ عرصے کے دوران میں خبری مواد میں بیان اور تقاریر پر مشتمل مواد کا تناسب ۳۶ر فیصد رہا جس میں سے ۳۸ر فیصد مواد صحافتی اقدار اور روایات کے عین مطابق یعنی معروضی قرار دیا جاسکتا ہے جب کہ ۶۲ر فیصد مواد ایسا ہے جس میں ایسے عناصر پائے جاتے ہیں جو اخلاق کے بنیادی تقاضوں سے متصادم ہیں، اس کی چند نمایاں مثالیں درج ذیل ہیں:

الزامات اور جوابی الزامات:

جولائی ۱۹۵۸ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان دریائی پانی کی تقسیم کے معاملات میں کشیدگی پائی جاتی تھی جس کے اثرات قومی سیاست پر بھی محسوس کیے گئے۔ اس معاملے میں حکومت اور حزب اختلاف کے قائدین کے درمیان بیان بازی کا سلسلہ جاری رہتا تھا جس میں دونوں طرف سے حدود سے تجاوز کی بے شمار مثالیں سامنے آئیں۔ جیسے سابق وزیراعظم چودھری محمد علی نے اپنے ایک بیان میں اُس وقت کے وزیراعظم ملک فیروز خان نون کی آبی پالیسی پر تنقید کی تو اس کے جواب میں انھوں (وزیراعظم) نے نہری تنازعے سے متعلق سابق وزیراعظم کے بیان کو گمراہ کن قرار دیتے ہوئے کہا کہ چوہدری صاحب کو چاہئے تھا کہ وہ اپنے دور اقتدار میں ہوائی قلعے تعمیر کرنے کے بہ جائے ملک میں کچھ آبی ذخائر ہی تعمیر کر دیتے تاکہ وقت پڑنے پر ملک کو اس کی ضرورت کے مطابق پانی مل جاتا[۱۷]۔

اخلاقی حدود سے تجاوز:

اس عنوان کے تحت خبری مواد میں ایسا مواد شامل ہے جس میں اخلاقی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے مخالفین کو خائن، بددیانت، ملک دشمن یا غدار قرار دینے کے علاوہ اُن کے ناموں کو بھی بعض اوقات بگاڑا گیا۔ اس طرح کے مواد کی الگ الگ شناخت آسان نہیں کیوں کہ ایک ہی تقریر یا بیان میں یہ تمام عناصر موجود ہوسکتے ہیں، اس لیے زیرنظر جائزے میں بھی انھیں الگ الگ زمروں میں تقسیم کرنے کے بہ جائے اکٹھا ہی رکھا گیا۔ اس طرح کے مواد کی مقدار عمومی طور پر زیادہ پائی گئی۔

زیر جائزہ زمانے میں ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت ملک کو انتظامی لحاظ سے ون یونٹ بنادیا گیا تھا جس کی وجہ سے علاقہ پرستی کی سیاست زور پکڑ رہی تھی اور اس کے رد وحمایت میں بیان بازی کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس سلسلے میں حزب اختلاف کے راہ نما سردار بہادر خان کا بیان اس کی ایک مناسب مثال ہے جس میں انھوں نے کہا کہ حکومت نے امریکی ایما پر ملک کے اندر پختونستان کے قیام کا مطالبہ عملی طور پر تسلیم کر لیا ہے۱۸۔

اس زمانے میں مقبوضہ کشمیر میں سیاسی کشیدگی عروج پر پہنچی ہوئی تھی جس کے اثرات (مغربی) پاکستان میں بھی محسوس کیے جاتے تھے۔ تحریک آزادی کے ایک اہم راہ نما اور مقبوضہ کشمیر کے ایک مہاجر چودھری غلام عباس نے اعلان کر دیا کہ وہ عوام کی ایک بہت بڑی تعداد کے ساتھ لائن آف کنٹرول (اس زمانے میں خط متارکہ جنگ) عبور کر کے کشمیری عوام کی عملی حمایت کے لیے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو جائیں گے۔ حکومت کے نزدیک یہ کوئی مناسب حکمت عملی نہ تھی، اس کے نتیجے میں جانی نقصانات کے علاوہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ کا بھی خطرہ تھا۔ اس خدشے کے پیش نظر حکومت نے قافلوں کے لائن آف کنٹرول کی طرف جانے پر پابندی عائد کر دی لیکن تحریک کشمیر کے راہ نما چوہدری غلام عباس اس کے باوجود ضد پر قائم رہے تو انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ ان کی گرفتاری پر پورے ملک میں احتجاج کی لہر دوڑ گئی اور حزب اختلاف کی جماعتوں نے ان کے حق میں جلسے جلوس شروع کر دیے۔ اس سلسلے میں ایک بہت بڑا جلسہ لاہور میں ہوا جس میں صف اوّل کی سیاسی قیادت کے علاوہ مولانا مودودیؒ جیسی شخصیت نے بھی شرکت کی۔ اس جلسے سے خطاب کرتے ہوئے ممتاز صحافی آغا شورش کاشمیری نے کہا کہ جو کام پنڈت نہرو کرنا چاہتے تھے، وہ کام ملک فیروز خان نون نے کر دکھایا ہے۔ اسی خطاب میں انھوں نے یہ بھی کہا کہ ایسی غداری کی توقع ہمیں پنڈت نہرو سے بھی نہیں تھی۱۹۔

سیاسی مخالفین پر قومی مفادات سے روگردانی کے الزامات عائد کرنے کے علاوہ انھیں نفرت انگیز ناموں سے بھی یاد کیا جاتا۔ اس سلسلے میں خدائی خدمت گار تحریک کے بانی خان عبدالغفار خان عام طور پر نشانہ بنائے جاتے۔ نوائے وقت کے خبری کالم ہوں یا دیگر مندرجات، ان کے لیے ہر جگہ سرحدی گاندھی کے لقب کو بہ طور طنز استعمال کیا جاتا جیسے درج ذیل سرخی:

''سرحدی گاندھی کی طرف سے مسلم لیگ کو سنگین نتائج کی دھمکی۲۰۔

واقعاتی خبریں:

بیانات سے ہٹ کر واقعاتی خبروں میں ان تمام خبروں کو شمار کیا گیا جو کسی بھی طرح سے سیاسی عمل سے متعلق تھیں۔ تصادم کی کیفیات، مار پیٹ، تشدد، پکڑ دھکڑ اور گرفتاری وغیرہ کے علاوہ کسی بھی سیاسی معاملے کے جواب میں سرکاری اقدامات اس زمرے میں شامل کیے گئے جو صورت حال کو تشدد اور تصادم کی طرف لے جاتے جس کے نتیجے میں فطری طور پر کشیدگی اور الزام تراشی کے علاوہ تشدد اور تصادم کا امکان دکھائی دیتا، یعنی اس صورت حال کا نتیجہ بھی اسی ماحول کی پیدائش کا باعث بنتا ہے جس میں معاملات تلخی کی طرف جاتے ہیں۔ جولائی ۱۹۵۸ء کے پورے مہینے

میں اس قسم کی کئی خبریں اخبار میں شائع ہوئیں۔ان خبروں میں نمایاں ترین وہی خبریں تھیں جو تحریک کشمیر کے لائن آف کنٹرول کی طرف جانے والے قافلوں کو روکنے اور تحریک کے قائدین کی گرفتاری وغیرہ کی صورت میں پیش آئیں۔اس طرح کی خبروں کے مندرجات سے اس قسم کا تاثر پیدا ہوتا کہ جیسے سرکاری اقدامات کا نشانہ بننے والے لوگوں پر ظلم ہو رہا ہے، مثال کے طور پر چوہدری غلام عباس کی دوبارہ گرفتاری کی خبر۔اس خبر کی تفصیلات میں بتایا گیا تھا کہ تحریک کشمیر کے قائد چوہدری غلام عباس جنھیں گزشتہ روز رہا کیا گیا تھا، آج اس حالت میں گرفتار کر لیا گیا کہ وہ مظفر آباد کی طرف گامزن تھے۔خبر میں بتایا گیا کہ وہ اوران کے ساتھ جانے والے لوگوں کا مقصد مقبوضہ کشمیر میں اپنے گھروں کو واپس جانا ہے اور انھیں اس سفر سے روکنا ان کے بنیادی حق کو غصب کرنے کے مترادف ہے۔اسی خبر میں یہ بھی بتایا گیا کہ پولیس نے بعض گرفتار شدگان کو نامعلوم مقام پر پہنچا دیا ہے[۲۱]۔پکڑ دھکڑ، گرفتاریوں اور لائن آف کنٹرول کی طرف مارچ کو روکنے کی ان کوششوں کے ردعمل میں ملک کے بعض حصوں میں عید کا تہوار تک نہیں منایا گیا، یہ خبریں تلخی میں مزید اضافے کا باعث بن گئیں[۲۲]۔

اداریہ:

کسی اخبار کا سب سے معتبر اور قابل احترام مواد اداریہ ہے جس میں اخباری ادارہ کسی بھی صورت حال کا جائزہ لے کر اپنی رائے دیتا ہے۔قومی، مقامی یا عالمی امور پر رائے ظاہر کرنے کے باوجود صحافتی ادارے کی یہ کوشش بہر حال ہوتی ہے کہ وہ اپنی غیر جانب داری اور جن طبقات یا افراد کے بارے میں رائے ظاہر کی جارہی ہے، ان کا احترام بہر صورت برقرار رکھا جائے لیکن اس زمانے میں صورت حال مختلف دکھائی دیتی ہے۔زیر مطالعہ عرصے کے دوران میں اخبار میں مختلف موضوعات پر لکھے جانے والے ۲۴/ فیصد اداریے معروضیت کے معیار پر پورے اترے جب کہ ۷۶/ فیصد اداریوں میں ایسا مواد پایا گیا جو اخلاق اور صحافت، دونوں کے معیار سے متصادم تھا۔مثال کے طور پر ون یونٹ کی مخالفت کرنے والے سیاسی طبقات کے بارے میں اخبار کے ایک اداریے کا اقتباس:

> ''سرحدی گاندھی اور مسٹر جی ایم سید کے تیور یہ بتاتے ہیں کہ انھیں مطمئن کرنے کی جتنی کوشش بھی کی جائے گی ،ان کے مطالبات اسی رفتار سے بڑھتے جائیں گے۔ وہ کبھی نہیں چاہیں گے کہ ملک میں سیاسی استحکام پیدا ہو یا مرکز کے ہاتھ مضبوط ہوں جن کا مقصد و مدعا یہ ہو کہ ملک میں انتشار پھیلے، بے چینی پیدا ہو اور سیاسی اکھاڑ پچھاڑ ہوتی رہے، وزارتوں کی شکست و ریخت جن کی پسندیدہ ہابی ہو اور ملک سے جن کی وفاداریاں مشتبہ ہوں ، ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کسی انتظام پر مطمئن ہو جائیں گے جو افتراق و انتشار انگیزی پر منتج نہ ہو ، تھور (کے پودے) سے دودھ حاصل کرنے کے مترادف ہے[۲۳] ۔

درج بالا اقتباس میں ایسی سیاسی شخصیات سے جنھیں اخبار پسند نہیں کرتا، ان کے نام بگاڑنے کے علاوہ انھیں شر پسند اور قومی مفادات کا مخالف ہی قرار نہیں دیا گیا بلکہ معاملہ غداری کے الزام تک جا پہنچا ہے۔''نوائے وقت''

کے ادارتی کالموں میں یہ رجحان کافی مضبوط دکھائی دیتا ہے۔ وزیراعظم ملک فیروز خان نون نے لائن آف کنٹرول کو توڑ کر مقبوضہ کشمیر میں داخل ہونے کے عمل کو جنگ کا پیش خیمہ قرار دیا تو اخبار نے ان کی رائے پر جو تنقید کی، وہ بھی اسی ذہن کی عکاس ہے:

> ''ہم ملک صاحب کو ان کی زندگی کا ایک باب یاد دلانا چاہتے ہیں، ۱۸، ۱۹ برس پہلے برطانیہ اپنی بے سروسامانی کے عالم میں اس وقت کی عظیم ترین فوجی طاقت کا چیلنج قبول کرتے ہوئے میدان میں کود پڑا تھا۔ ملک فیروز خان نون اس دوسری جنگ عظیم کے زمانہ کے شروع سے آخر تک انگریزوں کے ماتحت ہندوستان کے وزیر دفاع رہے اور انھوں نے ہندوستانیوں کو جن میں مسلمان پیش پیش تھے، انگریزوں کے ماتحت فوج میں بھرتی کرایا اور یہ لوگ دنیا کے ہر محاذ پر برطانیہ کی لڑائی لڑتے رہے۔ اس وقت ملک صاحب کو سال ہا سال یہ بات کیوں نہ سوجھی کہ جنگ ایک فضول اور تباہ کن شے ہے''[۲۴]۔

اداریے میں ملک کے وزیراعظم کو بالواسطہ طور پر سابق انگریزی استعمار کا ایجنٹ قرار دینے میں ذرا بھی تکلف سے کام نہیں لیا گیا۔ اسی موضوع پر ایک اور اداریے جس میں ان کی کشمیر پر پالیسی کو ہدف تنقید بنایا گیا، انھیں بھارتی وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو اور مقبوضہ کشمیر کے اس وقت کے وزیراعظم بخشی غلام محمد کے ہاتھ مضبوط کرنے والا قرار دیا[۲۵]۔

مضامین، کالم اور توضیحی مواد:

اسلوب کے اعتبار سے ان تحریروں میں تھوڑا تھوڑ فرق ہوتا ہے لیکن ان تینوں قسم کی تحریروں میں لکھنے والا اپنی رائے کے اظہار میں کافی آزادی رکھتا ہے، اس لیے ان اسالیب میں تنقید کرتے ہوئے کسی شخصیت یا طبقۂ خیال کے بارے میں بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس جائزے میں سامنے آیا کہ ان تحریروں میں تنقید کرتے ہوئے صاحب تحریر اسی منطقے میں جا نکلتے ہیں جس میں تنقید کی زد میں آئے ہوئے شخص کی نیت پر شک وشبے کے علاوہ اس کی دیانت اور وفاداری پر طعن زنی بھی اکثر کی جاتی۔ اس عرصے میں سیاسی موضوعات سے متعلق شائع ہونے والے سارے مواد کو معروضیت کی ذیل میں رکھنا مشکل ہے، پورے کا پورا یعنی ۱۰۰ رفیصد مواد اخلاق اور صحافت کے ضابطوں پر پورا نہیں اترتا۔ ''نوائے وقت'' کی ایک توضیحی رپورٹ میں خان عبدالغفار خان کی اس وقت کے صدر سکندر مرزا سے ملاقات پر اس طرح تبصرہ کیا گیا:

> ''سرحدی گاندھی کی صدر پاکستان سے نتھیا گلی میں ملاقات کو بڑی تشویش سے دیکھا جارہا ہے اور تعجب کا اظہار کیا جارہا ہے کہ اس ملاقات کی آخر ضرورت کیا تھی؟ بہ حیثیت صدر میجر (جنرل) اسکندر مرزا کوئی سیاسی آدمی نہیں، نہ سرحدی گاندھی کی یہ حیثیت ہے کہ ان سے معمولاً ملاقات قابل فہم ہو۔ وحدت مغرب (مغربی پاکستان) تو کیا انھوں نے پاکستان کو قبول نہیں

کیا۔ ایسے بزرگوار سے ملاقات کے کیا معنی ہیں؟[۲۶]۔''

یعنی خان عبدالغفار خان کو ان کے اصل نام سے پکارنے کے بہ جائے طنزیہ طور پر انھیں گاندھی قرار دیا گیا جو پاکستانی عوام کی ایک بڑی تعداد کے لیے قابل فخر ہونے کی بہ جائے گالی کے مترادف تھا۔ اخبار کے مستقل کالم ''سرراہے'' میں کالم نگار نے آزاد کشمیر کے صدر سردار محمد ابراہیم خان کو درج ذیل الفاظ میں قومی مفادات کا امین ہونے کے بہ جائے ایک لالچی اور غرض کے بندے کے طور پر پیش کیا:

> ''کراچی کے ایک مؤقر اخبار نے سردار ابراہیم خان، صدر آزاد کشمیر سے سوال کیا ہے کہ کیا سردار ابراہیم خان کو اپنی صدارت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا؟ کیوں نہیں، عہدہ صدارت کے ساتھ کرسیِ صدارت نظر آتی ہے اور اس عہدے کی تنخواہ نظر آتی ہے''[۲۷]۔

نوائے وقت جولائی ۱۹۵۸ء کے مندرجات کے جائزے سے یہ واضح ہوا کہ اخبار میں سیاست کے موضوع پر شائع ہونے والے مواد کی تقریباً دو تہائی مقدار یعنی ۶۷ رفیصد میں ایسے الفاظ یا جذبات کا اظہار کیا گیا جن کی وجہ سے متحارب سیاسی جماعتوں کے درمیان اختلاف رائے معقولیت کی حدود سے نکل کر تلخی اور قریب قریب بدزبانی کی حدود میں داخل ہوگیا، ان بیانات اور تحریروں میں رکیک حملے کیے جاتے، یوں سیاسی مکالمے کے دوران ایک دوسرے کو کم فہم، قومی مقاصد سے بے بہرہ، قومی مفادات کے تحفظ سے بے اعتنائی بلکہ مجرمانہ غفلت کا مرتکب ٹھہرایا جاتا۔ مخالفین کے سیاسی مقاصد کو قومی مقاصد سے روگردانی کا مرتکب قرار دے کر انھیں بالواسطہ طور پر ملک دشمن اور غدار قرار دیا جاتا۔ اس مجادلے میں سیاسی مخالفین کے ساتھ ساتھ خود اخبار بھی شریک ہوگیا جس کی واضح مثال اخبار کی سب سے معتبر صنف اداریے میں بھی ان کیفیات کا در آنا ہے۔ اس جائزے کے ذریعے یہ نکتہ بھی سامنے آیا کہ نام بگاڑنے کے معاملے میں سیاسی مخالفین سے زیادہ خود اخبار سرگرم رہا اور اس نے سرخ پوش تحریک کے بانی خان عبدالغفار خان کا جب بھی ذکر آیا، انھیں سرحدی گاندھی کے نام سے ہی یاد کیا۔ اس کیفیت کو اعداد و شمار میں دیکھیں تو یہ ننانوے فیصد سے بھی زائد ہے۔ اخبار خان عبدالغفار خان کا نام بگاڑنے کا اتنا عادی تھا کہ اگر خبر کی تفصیل میں یہ لفظ شامل نہیں ہوتا تھا تو خبر کی سرخی میں یہ کسر پوری کر لی جاتی تھی۔ نام بگاڑنے کے علاوہ اُن کے سیاسی کردار کا تذکرہ بھی نہایت کراہت سے کیا جاتا اور ظاہر کیا جاتا کہ ان لوگوں کا سیاسی مفاد پاکستان کے مفادات کے بالکل برعکس ہے۔ خان عبدالغفار کے علاوہ سندھ کے راہ نما جی ایم سید اور بلوچستان کے عبدالصمد اچک زئی سمیت بعض دیگر قائدین کے بارے میں بھی یہی رویہ روا رکھا گیا۔

سیاسی مہم جوئی، جلسے جلوس، ہنگامہ آرائی اور توڑ پھوڑ وغیرہ کے خلاف اگر حکومت انتظامی طاقت استعمال کرتی ہے اور اس کے نتیجے میں گرفتاریاں ہوتی ہیں یا جانی نقصان ہوجاتا ہے تو اس کے نتیجے میں نظریۂ ابلاغی اضطراب کے مطابق دو طرح کے اثرات پیدا ہوتے ہیں، اوّل، تصادم کے ماحول کو تقویت ملتی ہے اور دوم، تصادم کی یہ کیفیت ماحول میں پہلے سے موجود تلخی میں مزید اضافے کا باعث بن جاتی ہے، یوں تحریر ہو یا تقریر، ہر دو میں غیر معیاری رویے فروغ پاتے ہیں، لہٰذا اس جائزے سے یہ مفروضہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اخبار میں سیاست کے تعلق

سے شائع ہونے والے مواد میں غیر معیاری مواد کثرت سے پایا جاتا ہے جس میں بدزبانی عام تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے سیاسی سرگرمی (یا کسی بھی قسم کی سرگرمی کے دوران) مکالمے میں تسلسل کے ساتھ اگر ایسی زبان و بیان عادت ثانیہ بن جائے تو معاشرے پر اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ یہ تحقیقی سرگرمی اسی سوال کے جواب کے حصول کی ایک کوشش ہے۔

ذرائع ابلاغ عامہ کے توسط سے تکرار سے دیے جانے والے پیغامات کے مثبت اثرات پر بہت کام ہوا ہے۔ اس سلسلے میں دو برطانوی محققین ہارپر اور فیلو کا کام قابل قدر ہے جو کہتے ہیں کہ میڈیا کے ذریعے تسلسل سے پھیلنے والے کسی پیغام کے ذریعے یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ اس کی مدد سے معاشرے میں اچھی عادات و خصائل پیدا ہوجائیں، لوگوں کا معیار زندگی بہتر اور صحت مند ہو جائے یا حکومت کو اپنی پالیسیوں کے نفاذ میں آسانی میسر آئے[۲۸]۔ اس تحقیق کے مطابق اس سلسلے میں روایتی میڈیا کے علاوہ نیو میڈیا کا کردار بہت اہم ہے[۲۹]۔ پاکستان میں بھی بعض ایسی ابلاغی مہمات چلائی گئی ہیں جن کے دور رس سیاسی و قانونی اثرات مرتب ہوئے، ان میں ایک نمایاں مہم ''Just Do It'' تھی جو پاکستان کے بڑے میڈیا گروپ ''جنگ'' کی طرف سے چلائی گئی جس کا مقصد حدود آرڈیننس میں تبدیلی تھا، یہ مہم کامیابی سے ہم کنار ہوئی تھی۔ یہ اُن ابلاغی مہمات کا تذکرہ ہے جن کے مثبت اثرات مرتب ہوئے یا اثرات کی نوعیت ویسی ہی رہی جیسی چاہی گئی، گویا اس طرح کی ابلاغی مہمات بھی تشہیری (Advertisement) طریقۂ کار کے مطابق چلائی جاتی ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پیغام کی نوعیت ویسی نہ ہو جس کا گزشتہ سطور میں تذکرہ کیا گیا ہے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ہمارے خطے، خاص طور پر پاکستان میں اس قسم کے موضوعات تاحال توجہ نہیں دی گئی۔ البتہ ستر کی دہائی میں امریکی صدارتی انتخابات کے لیے چلائی گئی ابلاغی مہمات کے اثرات پر کافی کام ہوا ہے جس کے مطابق ان مہمات میں اگر منفی طرز عمل اختیار کرلیا جائے تو اس کے نتیجے میں سیاسی عمل سے بے زاری پیدا ہوتی ہے اور یوں انتخابی عمل میں عوام کی شرکت میں کمی واقع ہوجاتی ہے[۳۰]۔ یہ نظریہ وہی ہے جسے ابلاغی اضطراب کا نام دیا گیا۔ بعد کے محققین یعنی جان کلینے جین ہوئیس (Jan Kleinnijenhuis)، ڈرک اوجیما (Dirk Oegema) اورانیتا وان ہوف (Anita van Hoof) کے علاوہ ڈائنا سی مز (Diana C. Mutz) اور بائرن ری ویس (Byron Reeves) نے اس نظریے کے اخلاقی پہلو پر جو کام کیا ہے، وہ زیر بحث موضوع سے قریب ترین ہے۔ ان محققین کے مطابق جب سیاسی مکالمہ اخلاقی حدود عبور کر جائے تو اس کے نتیجے میں خرابی پیدا ہوتی ہے اور رائے عامہ سیاسی عمل سے دور ہو جاتی ہے[۳۱]۔ لیکن سیاسی عمل سے دور ہو جانے والی رائے عامہ پر اُن غیر اخلاقی رویّوں کے اثرات کیا ہوتے ہیں جو ان ذرائع سے سامنے آتے ہیں؟ اس کا سراغ تو نہیں ملتا لیکن ابلاغ عامہ کے دیگر ذرائع یعنی فلم، ٹیلی ویژن اور ویڈیو گیم وغیرہ کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ زبان کی تلخی، کرخت لہجہ اور اس کی دیگر شکلیں بعض صورتوں میں انسان کی ضرورت ہیں۔ ان کا اظہار عام طور پر اس وقت ہوتا ہے جب کوئی انسان یا افراد کا کوئی گروہ کسی مایوسی اور بے چینی

کا شکار ہو۔ اس مایوسی کا نتیجہ جسمانی تشدد اور فسادات کی صورت میں نکل سکتا ہے لیکن ایسی کیفیت میں جب کوئی چیخ چلا کر اپنے غصے کا اظہار کرے یا گالی گلوچ کا سہارا لے تو اس کے نتیجے میں تشدد اور فساد کا راستہ رک جائے گا۔ یہ انسانی معاشرے کا ایک عام مشاہدہ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ انسان ابتدائی دنوں میں جب وہ بچہ ہوتا ہے، ایسے الفاظ اور ایسی زبان کیسے سیکھتا ہے؟ ان ماہرین کے مطابق ابتدائی طور پر انسان یہ چیزیں اپنے گھر اور معاشرے سے سیکھتا ہے لیکن جب سے سیٹلائیٹ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کا استعمال عام ہوا ہے، انسان ایسے طرزِ اظہار کا ایک آسان ہدف بن گیا ہے ، البتہ یہ بات اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے کہ مختلف طبائع پر اس کے اثرات مختلف ہوتے ہیں[۳۲] ۔

نفسیات میں ایسے مواد کو جس میں سخت زبان کے استعمال، گالی گلوچ اور ڈانٹ ڈپٹ وغیرہ کو تشدد کی ایک شکل قرار دیا گیا ہے، اس کے اثرات کے بارے میں اتفاق ہے کہ یہ جسمانی اثرات جتنے ہی مہلک ہو سکتے ہیں۔ ہارورڈ (Harvard) کی تحقیق کہتی ہے کہ ڈانٹ ڈپٹ، مغلظات، (کسی پر) چیخنا، الزام تراشی ، توہین ، دھمکانا، تمسخر، رسوا کرنا اور تنقید کا نشانہ بنانا، یہ سب افعال اتنے ہی ضرر رساں ہیں جتنا کہ جسمانی تشدد۔ اس تحقیق میں مزید کہا گیا ہے کہ یہ ایسی علامات ہیں جن کے اثرات کسی انسانی ذہن پر ان کے وقوع پذیر ہو جانے کے بعد بھی اسی طرح رونما ہو سکتے ہیں جیسے جنگوں کے بعد اِن سے متاثر ہونے لوگوں پر۔ اِن محققین کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ بچے جنھیں زبان سے مسلسل بدسلوکی کا نشانہ بنایا جاتا رہے، عام طور پر اُن کی بڑی تعداد جسمانی جارحیت کی عادی ہو جاتی ہے، مجرمانہ ذہنیت ان میں راسخ ہو جاتی ہے۔ ان کی شخصیت میں عدم توازن، عدم استحکام، تندمزاجی، خود پسندی، دماغی اضطراب (obsessive-compulsive disorder) اور دماغی امراض (Paranoia) پیدا ہو جاتے ہیں[۳۳] ۔

ہارورڈ کی اس تحقیق کا تعلق عمومی انسانی روّیوں اور براہ راست یعنی رو در رو رابطوں سے ہے، گویا اِس میں ایسی صورت حال سے متعلق بنیادی ضابطہ بیان کرد یا گیا ہے تاہم جنرل پیڈیاٹرک (*Jounral Pediatrics*) میں شائع ہونے والی تحقیقات میں ذرائع ابلاغ کی مختلف شکلوں کے اثرات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے جس کے مطابق فلموں، ٹیلی ویژن شوز اور ویڈیو گیمز جن میں ایسا مواد پایا جائے جس کا تعلق جنسی معاملات سے ہو یا ان میں زبان کا کھردرا پن ہو اور جارحانہ روّیے دکھائے جائیں ، ان کے صارفین میں بھی جارحیت اور تشدد کی کیفیات جڑ پکڑ لیتی ہیں[۳۴] جس کے اثرات معاشرے کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے برعکس ایک اور ماہر نیل ہارمن (Neal Harmon) کہتے ہیں کہ اگر آپ گھر کے ٹیلی ویژن لاؤنج میں بیٹھ ایک ایسی فلم دیکھیں جس میں نامناسب الفاظ کا استعمال ہو اور ان کی تکرار بھی ہو رہی ہو تو کانوں میں پڑنے والے ایک ایک لفظ کے گھر کے ہر فرد پر (اپنی اپنی نوعیت کے) اثرات ہوں گے۔ الفاظ کی اس بم باری سے خود کو بچانا بھی ضروری ہے اور دیگر افراد خانہ، خصوصاً بچوں کو بھی[۳۵]۔ وہ اس طرح کی زبان کے اثرات کو ایک نظام کی صورت میں دیکھتے ہیں یعنی خیالات الفاظ کی صورت میں ڈھل کر عملی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو بالآخر معاشرے کو تباہی سے دوچار کر دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ

اگر اس رجحان کے سامنے بند نہ باندھا گیا تو ہماری ثقافت اور مستقبل کے بارے کوئی خوش گمانی رکھنی مشکل ہوگی[۳۶]۔ سائیکالوجی کی تحقیق سے وابستہ ایک معروف بین الاقوامی جریدے *Psychology Today* نے Parents Television Council کے زیر اہتمام ٹیلی ویژن سے نشر ہونے والے غیر معیاری مواد کے اثرات کے بارے میں ایک تحقیق شائع کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ٹیلی ویژن پر غلط زبان کے نشر ہونے کی وجہ سے نہ صرف عمومی طور پر تہذیبی زوال کی رفتار تیز ہوگئی ہے بلکہ اخلاقی اقدار بھی تیزی سے متاثر ہو رہی ہیں۔ کونسل کی ڈائریکٹر ریسرچ میلیسا کلاڈ ویل (Melissa Caldwell) نے اس تحقیق کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا:

> ''نامناسب (Foul) زبان، جارحیت کی زبان ہے، یہ (انسان اور معاشرے کو) تشدد کی طرف لے جاتی ہے اور انگریزی زبان کو خراب کرنے کا باعث بن رہی ہے[۳۷]۔

نامناسب زبان کے معاشرے پر اثرات کے بارے میں ایک اور محقق ڈاکٹر ڈائنے ہووارڈ (Dr. Diane Howard) اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بچوں، نوجوانوں اور دیگر افراد معاشرہ کے سامنے ذرائع ابلاغ کے توسط سے زبان کے جارحانہ استعمال نیز عریانی اور فحاشی کے مظاہر عام ہو جائیں تو اس کے نتیجے میں لوگوں میں صلہ رحمی کا خاتمہ ہو جاتا ہے، ہم آہنگی پیدا کرنے کی صلاحیت کمزور ہو جاتی ہے اور لوگ عام طور پر بدلحاظ ہو جاتے ہیں[۳۸]۔

یہ مطالعے اور تحقیقات ذرائع ابلاغ کے توسط سے سامنے آنے والے زیر بحث مواد کے اثرات کی جانب بڑے واضح اشارے کرتی ہیں۔ یہ تحقیقات بتاتی ہیں کہ اس قسم کا مواد اگر تسلسل سے اپنے ناظرین اور صارفین تک پہنچتا رہے تو اس کے اثرات کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے، ایسی صورت میں ایسے مواد کے صارفین ایسے رویوں کے عادی ہو جاتے ہیں اور اُن کے ذہن سے برائی یا بری اقدار کے بارے میں حساسیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور ان کے ہاں ان عادات، زبان یا طرز عمل کے اختیار کرنے میں جو عار ماضی میں رہی ہوتی ہے، اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور یوں اچھی عادات کی جگہ عادات بدلے کر معاشرے کو خطرات سے دوچار کر دیتی ہیں۔ اسی نظریۂ انحطاطِ حساسیت (Theory of Desensitization) نے ماہرین کو اس نتیجے تک پہنچایا ہے[۳۹] (جس کا ذکر اس جائزے کے گزشتہ صفحات میں تفصیل سے کیا گیا ہے)۔

اس بحث کی روشنی میں پاکستانی ذرائع ابلاغ کا جائزہ لیا جائے تو بڑی واضح صورت حال سامنے آتی ہے۔ نظریۂ ابلاغی اضطراب پر ہونے والے کام کے کچھ حصے جن میں بدتہذیبی کو موضوع بنایا گیا ہے، ان کی روشنی میں پاکستان میں پہلے ملک گیر مارشل لا کے نفاذ سے قبل کے جس اخباری مواد کا تجزیہ کیا گیا ہے، اس میں وہ تمام عناصر بہ درجہ اتم پائے گئے ہیں جو معاشرے میں مایوسی پیدا کر کے اُسے اچھی تہذیبی اقدار سے بے گانہ کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اس تجزیے میں یہ رجحان بھی سامنے آیا کہ جیسے جیسے سیاسی فضا کی حدت میں اضافہ ہوتا ہے، اسی رفتار سے اس نوعیت کے مواد کی مقدار میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ مواد کی مقدار میں اضافے کا یہ ایک پہلو ہے لیکن اچھی تہذیبی اقدار سے محروم مواد جب ایک بار ذرائع ابلاغ میں جگہ پانے لگے تو حالات جیسے بھی ہوں، ''حیا'' کا یہ بند دروازہ آپ سے آپ کھل جاتا ہے اور یہ رجحان ترقی کرتا ہے۔ اس کا ثبوت ہالی ووڈ کی فلموں کے بارے میں ایک

تحقیق سے ہوتا ہے۔ وِڈ اینگل (VidAngle) کی ایک تحقیق کے مطابق ہالی ووڈ کی فلموں میں بدتہذیبی کا آغاز ۱۹۳۹ء میں ایک فلم Gone with The Wind سے ہوا تھا، ۲۰۱۳ء میں The Wolf of The Wall Street نامی فلم کے آنے تک اس رجحان میں آٹھ سو فیصد تک اضافہ ریکارڈ کیا گیا[۴۰]۔

ہالی ووڈ سے متعلق تحقیق کی طرح حتمی طور پر تو یہ دعویٰ کرنا آسان نہیں کہ پاکستانی یا اردو اخبارات میں بدتہذیبی کا نکتۂ آغاز کیا ہے لیکن پاکستان کے ابتدائی برسوں کے اخبارات کے زیرِنظر جائزے سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ ماضی میں پاکستانی اخبارات کے مندرجات، خاص طور پر جن کا تعلق سیاست سے ہو، بدتہذیبی پر مبنی مواد پایا جاتا رہا ہے۔ ۱۹۵۸ء سے ۲۰۲۰ء تک اس رجحان میں اعداد و شمار میں کتنا اضافہ ہوا؟ اس کے تعین کے لیے ایک جامع تحقیق کی ضرورت ہوگی لیکن موجودہ عہد کے اخبارات کا جائزہ لے کر بدتہذیبی کے رجحان کی ذیل میں آنے والے عناصر کو دیکھا جائے تو بہت آسانی کے ساتھ ان الفاظ و مظاہر کی ایک طویل فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔

ذرائع ابلاغ کے توسط سے عام ہونے والے بدتہذیبی کے ان مظاہر کو یہاں دو سطح پر دیکھا گیا ہے۔ پہلی سطح میں ذرائع ابلاغ میں کثرت سے استعمال ہونے والے الفاظ یا تصورات ہیں جب کہ اس کے دوسرے حصے میں معاشرے پر اس کے اثرات کی کیفیت کا ذکر ہے۔

۱۹۵۸ء کے بعد سے اب تک ۶۰ سے ۶۵ برس تک کا وقفہ ہے، اس عرصے کے دوران میں ذرائع ابلاغ میں تہذیبی انحطاط کے مظاہر کا موازنہ دلچسپ ہے۔ ۱۹۵۸ء اور آس پاس کے زمانے میں بھی سیاسی مخالفین کا ذکر بد تہذیبی اور تضحیک آمیز طریقے سے کرنے کا چلن تھا جس میں کسی کا نام بگاڑنے، نااہل قرار دینے یا قومی مفادات سے روگردانی کرنے کی روش خاص طور پر قابل ذکر ہے لیکن بعد کے زمانے (یعنی موجودہ عہد، اکیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں) میں اس قسم کے مواد کی مقدار میں اضافے کے علاوہ گالی کی حد تک زبان کی شدت یعنی بد تہذیبی میں اضافے کا رجحان سامنے آتا ہے۔ اس زمانے میں ایسے الفاظ کے کھلے عام استعمال کا رجحان کسی حد تک معمول بن چکا ہے، ماضی میں بدترین اختلاف کے باوجود جس سے گریز کیا جاتا تھا۔ ۱۹۵۸ء کے تجزیہ مشتملات میں حکومت پر نااہلی اور قومی خزانے کے نقصانات کا ذکر تو سامنے آتا ہے لیکن کسی کو کھلے عام چور کہہ دینے کی کوئی مثال نہیں ملتی لیکن نصف صدی کے بعد صورت حال میں زمین آسمان کا فرق دکھائی دیتا ہے۔ یہ فرق سیاست دانوں کی زبان میں بھی دکھائی دیتا ہے اور اخبار کے مزاج میں بھی، یعنی سیاست دان جو بات بین السطور کہنے کی کوشش کرتا ہے، اخبار اس پردے کو بھی اٹھا دیتا ہے۔ اس کی ایک مثال بدعنوانی اور سرکاری وسائل کی لوٹ مار کے الزام کے تحت اخباری صفحات جن میں خبری اور ادارتی، دونوں شامل ہیں جس قسم کا مواد شائع ہوا، اس میں یہ جملہ بہت دہرایا جس میں کہا گیا کہ چور کو چور نہ کہوں تو کیا کہوں؟ اسی طرح جھوٹے، کمینے اور منافق جیسے الفاظ کا ستعمال عام ہوا۔ اسی نوعیت کی ایک خبر جس میں صاحب تقریر جنھوں نے کسی شخصیت کا نام نہیں لیا تھا لیکن اخبار نے یہ لکھ کر کہ ''انھوں نے فلاں شخصیت کا نام لیے بغیر کہا کہ۔۔۔'' کے الفاظ استعمال کر کے وہ نام ظاہر کر دیا[۴۱]۔ اِس طرح کی

خبریں کئی رجحانات ظاہر کرتی ہیں۔ اوّل یہ کہ چور، منافق اور کمینے جیسے معیوب الفاظ کا استعمال کھلے عام کیا گیا ہے اور دوسرے یہ کہ گالی دینے والے نے اپنے ہدف کا نام نہ لے کر ہلکا سا پردہ رکھنے کی جو کوشش کی، اخبار نے وہ پردہ بھی اٹھا کر ایک مسلمہ صحافتی قدر کی خلاف ورزی کی، یعنی کہنے والے سے وہ بات بھی منسوب کر دی جو اس نے نہیں کہی، اس دور میں یہ رجحان خاصا مقبول دکھائی دیا۔

اسی دور میں بعض سیاست داں اور صحافی یہ تکلف بھی ہٹا دیتے ہیں۔ ملک کے ایک مؤقر روزنامے جنگ کے ادارتی صفحے پر شائع ہونے والے ایک کالم میں اس کے مصنف نے لکھا کہ ان دنوں ایک نوجوان سیاست داں نے اقتدار کے ایوانوں میں خاصی گرمی پیدا کر رکھی ہے، وہ جب بات کرتا ہے تو سیاست کے بڑے بڑے جرنیل بکری بن جاتے ہیں[۴۲]۔

یعنی اپنی گفت گو میں جو خراب زبان سیاست دان استعمال کرتا ہے، صحافی اپنی تحریر میں اسے دہرانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا بلکہ وہ خود اپنے طور پر بھی ایسا کر گزرتا ہے۔ گویا سیاست دان اور صحافیوں کا ایک طبقہ غیر مہذب روّیوں کے فروغ میں ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ ہو گیا۔ بعض صحافی اپنی تحریروں میں از خود بھی معیوب الفاظ روانی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، اس کی ایک مثال روزنامہ ''نوائے وقت'' کی مستقل کالم نگار طیبہ ضیا کی یہ تحریر ہے:

''نریندر مودی کے بیان پر ایک لاکھ دفعہ لعنت''[۴۳]۔

یہ رجحان اتنا عام ہوا کہ بعض ایسی باتیں بھی بولی اور لکھی جانے لگیں، مہذب معاشرے میں جنھیں زبان پر لانا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے، یہاں تک کہ لوگوں کے عقیدے کے بارے میں بھی علی الاعلان نامناسب گفت گو کی جاتی۔

سیاسی مخالفین کے نام تبدیل کرنا اور انھیں جانوروں کے مماثل قرار دینا بھی گالی گلوچ ہی کے مترادف ہے، یہ روایت اس زمانے میں بہت توانا ہوئی اور سیاسی مخالفین کو گدھا تک قرار دیا گیا[۴۴]۔

یہ سوقیانہ انداز گفت گو بول چال کی زبان پر بھی اثر انداز ہوا اور لکھنے کی زبان پر بھی جیسے ''پنگا'' جیسے الفاظ عام بول چال کے علاوہ صحافتی زبان اور نیو میڈیا یعنی سوشل میڈیا پر کھلے عام استعمال کیے جانے لگے[۴۵]۔

فیس بک اور سوشل میڈیا کی دیگر ویب سائٹس پر سیاسی نوعیت کے تبصرے دیکھے جائیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ پڑھنے کی چیزیں نہیں بلکہ خیالات کا بیت الخلا ہے جنھیں نقل کرنا بھی طبیعت پر بوجھ ہے لیکن محض رجحان کی نشان دہی کے لیے نسبتاً چند معتدل پوسٹیں پیش نظر ہیں۔ فیس بک پر متحرک علاقہ پرستی کے لیے شہرت رکھنے والے ایک ممتاز شخص نے صوبہ پنجاب کی تقسیم کے مسئلے پر ان کے مؤقف کی حمایت نہ کرنے پر ایک ممتاز کالم نگار اور ایک اور ممتاز ادیب کے ناموں میں توہین آمیز لاحقوں کا اضافہ کر کے ان کے بارے میں بات کی اور یہ بھی لکھا کہ یہ دونوں پنجاب کی تقسیم کے خلاف نہیں بولتے مگر قائد اعظمؒ کے مزار کے لیے بلبلاتے ہیں، دونوں پر لعنت[۴۶]۔

یہ معاملہ محض بولنے اور لکھنے تک محدود نہیں رہا بلکہ جسمانی تشدد تک بھی جا پہنچا۔ ۲۰۱۸ء کی انتخابی مہم کے دنوں میں کراچی سے ایک واقعہ رپورٹ ہوا جس میں بعض نوجوانوں نے گدھے پر کسی شخص کا نام لکھ کر اسے تشدد کا نشانہ بنایا[۴۷]۔ یہ بے زبان بعد میں تشدد کی تاب نہ لاتے ہوئے ہلاک ہو گیا۔ اس طرح کی صورت حال میں تشدد کا سلسلہ زیادہ وسعت اختیار کر جاتا ہے[۴۸]۔

پاکستان کی یہ صورت حال نظریۂ انحطاط حساسیت کے عین مطابق دکھائی دیتی ہے، ذرائع ابلاغ کے مواد میں تلخ بیانی اور پر تشدد پیغامات کی جو کیفیت پانچ چھ دہائی قبل دکھائی دیتی ہے، موجودہ دور میں اس میں بڑی حد تک اضافہ ہو چکا ہے بلکہ معاشرے پر بھی اس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ پاکستانی سماج میں عمومی طور پر بے اطمینانی اور اضطراب کی کیفیت ہمہ وقت محسوس کی جاتی ہے۔ پڑھے لکھے نوجوان ہوں، زیر تعلیم طلبہ یا دیگر افراد معاشرہ، ان کے روّیوں میں شدت، غصہ اور ذرا سے اشتعال یا خلاف مزاج بات پر ٹکرا جانے یا مدمقابل کو تباہ کر دینے جیسے جذبات صاف دکھائی دیتے ہیں۔

اکیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں کے دوران میں ملک کے سیاسی منظر نامے میں بعض نئی قوتیں شامل ہوئیں، ان قوتوں نے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے، اس کے بعد سے معاشرے کے مختلف حصوں اور مختلف طبقہ ہائے فکر کے درمیان کشیدگی عروج پر جا پہنچی۔ میدان سیاست میں آنے والی نئی قوتوں نے اپنے پیغام کی نشر و اشاعت کے لیے روایتی ذرائع ابلاغ کے علاوہ سماجی رابطے کے نئے وسائل کا بھی بھرپور اور جارحانہ استعمال کیا جس کے اثرات ذرائع ابلاغ کے ان شعبوں کے علاوہ لوگوں کے ذاتی مزاج اور ان کے باہمی تعلقات پر بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ مرکزی دھارے کی سیاسی قوتوں کے متحرک ہونے کے بعد شدت پسندی کے جو آثار سامنے آئے ہیں، نسبتاً محدود پیمانے پر اس سے قبل بھی جاری تھے جنھیں ملک کے مختلف حصوں میں کام کرنے والی نسلی اور لسانی تنظیموں کے علاوہ بعض مذہبی تنظیموں سے وابستہ نوجوانوں میں دیکھا جا سکتا تھا۔ فرقہ دارانہ بنیاد پر شدت پسندی اور (پاکستانی) طالبان کی تحریک کے زور پکڑنے سے پیدا ہونے والی صورت حال میں بھی ذرائع ابلاغ کے ان اثرات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

اس مطالعے کے ذریعے یہ رجحان سامنے آیا ہے کہ معاشرے کے نمایاں افراد جب غیر معیاری زبان استعمال کرتے ہیں تو اس کے نتیجے صرف ان کے پیروکار ہی ایسی زبان اور روّیوں کے فروغ کا باعث نہیں بنتے بلکہ ذرائع ابلاغ کے طرزِ اظہار پر اثرانداز ہونے علاوہ عام لوگوں کی بول چال کو بھی بدل ڈالتے ہیں۔ اس سلسلے میں قومی اور دیگر علاقائی زبانوں پڑنے والے اثرات بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں جن کا تشویش ناک مظہر بازاری الفاظ کا بے تکلفی سے استعمال ہے، ماضی میں جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ذرائع ابلاغ کے تفریحی پروگرام اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ٹیلی ویژن چینلوں پر جو مزاحیہ شو پیش کیے جاتے ہیں، ان میں لوگوں کے نام کھلے عام بگاڑے جاتے ہیں، ان کے چہرے مہرے اور لباس کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور ذو معنی الفاظ اس اہتمام سے بولے جاتے ہیں جن سے لوگوں کے جنسی جذبات بھڑک اٹھیں۔ حرف آخر یہ کہ پاکستانی ذرائع ابلاغ میں

دہائیوں پہلے بدزبانی، تلخی اور بداخلاقی کا جو رجحان شروع ہوا تھا، تقریباً چھ دہائیاں گزرنے کے بعد اس کی مقدار میں نہ صرف معتد بہ اضافہ ہو چکا ہے بلکہ اس کی شدت بھی بڑھ چکی ہے جس نے نہ صرف ذرائع ابلاغ کی مسلمہ اقدار کو نقصان پہنچایا بلکہ اچھی معاشرتی اقدار کے انہدام میں بھی حصہ لیا جس کی وجہ سے تہذیبی انحطاط کا ایک دل خراش منظر سامنے آتا ہے۔ ذرائع ابلاغ کا یہ تجزیہ مشتملات اس سلسلے میں یہ اصول بھی فراہم کرتا ہے کہ بدتہذیبی پر مشتمل مواد میں جس قدر اضافہ ہوگا، اسی قدر تہذیبی زوال کے مظاہر بھی غالب آتے جائیں گے، پاکستان اور اس سے ملتے جلتے حالات رکھنے والے معاشرے اس وقت اسی قسم کے چیلنج سے دوچار ہیں۔

حوالہ جات:

۱ عبدالرحمٰن ابن خلدون، مقدمہ ابن خلدون، مترجم علامہ راغب رحمانی دہلوی، کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۶ء، اشاعت دہم، ص ۳۷۴۔

۲ ایضاً، ص ۱۲۹۔

3 Robert M. Krauss & Chi- Yue Chiu, In *Handbook of social psycholog*; D. Gilbert, S. Fiske & G. Lindsey (Eds.), Boston: McGraw-Hill, pp. 41-88, Vol. 2, (4h ed.).
(http://www.columbia.edu/~rmk7/PDF/HSP.pdf).

۴ القرآن، سورۃ نمبر۲:۱۹۱۔

۵ ایضاً، سورۃ نمبر۵۹:۱۱۔

6. Craig A. Anderson and Brad J. Bushman, 'Media Violence and the General Aggression Model' in *Journal of Social Issues*, Medford, USA: The Society for the Psychological Study of Social Issue, 2018 , Volume74, Issue2.
https://doi.org/10.1111/josi.12275.

7. Ayub Sumbal, Malik.'Yellow journalism and the curse of corruption in Pakistan's media' in *Journalism*.co.uk, Brightonhttps: Mousetrap Media, 2011.
//www.journalism.co.uk/news-features/-yellow-journalism-and-the-curse-of-corruption-in-pakistan-s-media/s5/a543400/.
(This article was first published by the European Journalism Centre and reproduced with permission in this site).

8. Muhammad Moiz Khan, Ridha Shaukt Ali, Mahnoor Faisal & Hadiqa Fatima Mithani, In *Journal of Mass Communication*, Karachi: University of Karachi, 2016, Vol. 14, May 2016. *https://www.researchgate.net/publication/338113155_Today's_News_ is_tomorrow's_history_Impa ct_of_Yellow_Journalism_Tabloids_and_ Paparazzi_on_the_future_of_Journalism_and_future_history_of_Pakistan.*

9. Sidra Arshad & Badar Nadeem Ashraf, 'Journalism Ethics: Evidence from Media Industry of Pakistan' in *Global Media Journal* (Pakistan Edition), Islamabad: Allama Iqbal Open University, 2014, Volume (7), Issue (2), pages 25-36, *https://www.researchgate.net/publication/309590026_Journalism_ Ethics_Evidence_from_Media_Industry_of_Pakistan.*

10. Kurt Lang & Glady Engel Lang, Mass Media And Voting. In, *Readers In public Opinion And Communication*, Morris Janowitz and Paul M. Hirsch (Eds.) New York: Free Press, (1966), 2nd ed, P 336.

11. Pipa Noris, *A Virtuous Circle: Political Communications in PostIndustrial Societies*, Cambridge (UK), Cambridge University Press, 2000, *https://www.researchgate.net/publication/231382907_A_Virtuous_Circle_ Political_Communications_in_Postindustrial_Societies.*

12. Kemmeth Newton, "Mass Media Effects: Mobilization or Media Malaise?". In *British Journal of Political Science*, Cambridge, The University of Cambridge, 1999,Vl 29(4). doi: *https://doi.org/10.1017/S0007123499000289.*

13. Shuck. A. R. T., "Media Malaise and political cyniccism". In: *The International Encyclopedia of Media effects*, (eds), Patric Rossler ,Cynthia Hoffner, & Liesbet von Zoonen, Hoboken, NJ: John Wiley and Sons, 2017, DOI: 10.1002/9781118783764.wbieme0066.

14. Diana C. Mutz & Byron Reeves, "The New Videomalaise: Effects of Televised Incivility on Political Trust". In *The American Political Science Review*, Cambridge: Cambridge University Press, 2005, 99(1). *https://www.jstor.org/stable/30038915?seq=1.*

15. Shuck. A. R. T. , "Media Malaise and political cyniccism". In: *The International Incyclopedia of Media effects*, (eds), Patric Rossler ,Cynthia

Hoffner, & Liesbet von Zoonen, Hoboken, NJ: John Wiley and Sons, 2017, DOI: 10.1002/9781118783764.wbieme0066.

16. Craig A. Anderson & Brad J. Bushman. (2018).: "Media Violence and the General Aggression Model", in *Journal of Social Issues*, Medford, , (USA), Society for Psychology and and Study of Social Issues, Volume74, Issue2. *https://spssi.onlinelibrary.wiley.com/doi/full/10.1111/josi.12275.*

۱۷۔ ایسوسی ایٹڈ پریس پاکستان، ''نہری تنازعے سے متعلق چوہدری محمد علی کا بیان گمراہ کن ہے''، مشمولہ نوائے وقت، لاہور، ادارہ نوائے وقت، ۸/ جولائی ۱۹۵۸ء، ص ا۔

۱۸۔ ایسوسی ایٹڈ پریس پاکستان، ''پاکستان نے امریکی ایما پر عملاً پختونستان کا مطالبہ تسلیم کر لیا''، مشمولہ نوائے وقت، ، لاہور، ادارہ نوائے وقت، ۹/ جولائی ۱۹۵۸ء، ص ا۔

۱۹۔ اسٹاف رپورٹر، ''لاہور کے عظیم الشان جلسہ عام میں کشمیر کے متعلق حکومت کی پالیسی پر کڑی نکتہ چینی''، مشمولہ نوائے وقت، لاہور، ادارہ نوائے وقت، یکم جولائی ۱۹۵۸ء، ص ا۔

۲۰۔ ایجنسی فرانس پریس، ''سرحدی گاندھی کی طرف سے مسلم لیگ کو سنگین نتائج کی دھمکی''، مشمولہ نوائے وقت، لاہور، ادارہ نوائے وقت، ۶/ جولائی ۱۹۵۸ء، ص ۲۔

۲۱۔ نمائندہ نوائے وقت، ''چوہدری غلام عباس دوبارہ گرفتار کر لیے گئے''، مشمولہ نوائے وقت، لاہور، ادارہ نوائے وقت، یکم جولائی ۱۹۵۸ء، ص ا۔

۲۲۔ نمائندہ نوائے وقت، ''سیال کوٹ میں کشمیری مہاجرین نے عید نہیں منائی''، مشمولہ نوائے وقت، لاہور، ادارہ نوائے وقت، یکم جولائی ۱۹۵۸ء، ص ا۔

۲۳۔ اداریہ، ''یہ کبھی مطمئن نہ ہوں گے''، مشمولہ نوائے وقت، لاہور، ادارہ نوائے وقت، ۳/ جولائی ۱۹۵۸ء، ص ۳۔

۲۴۔ اداریہ، ''وزیر اعظم صاحب کا ارشاد گرامی''، مشمولہ نوائے وقت، لاہور۔ ادارہ نوائے وقت، ۸/ جولائی ۱۹۵۸ء، ص ۳۔

۲۵۔ اداریہ، ''کس کی خوش نودی؟''، مشمولہ نوائے وقت، لاہور، ادارہ نوائے وقت، ۳/ جولائی ۱۹۵۸ء، ص ۳۔

۲۶۔ نمائندہ خصوصی، ''مکتوب کراچی''، مشمولہ نوائے وقت، لاہور، ادارہ نوائے وقت، ۵/ جولائی ۱۹۵۸ء، ص ۲۔

۲۷۔ کالم، ''سرراہے''، مشمولہ نوائے وقت، لاہور، ادارہ نوائے وقت، ۹/ جولائی ۱۹۵۸ء، ص ۳۔

28. Happer, C., and Philo, G., 'The Role of the Media in the Construction of Public Belief and Social Change' in *Journal of Social and Political Psychology*, Marburg (Germany): Department of Psychology, Philipps University Marburg, 2014, l. 1(1), 321–336. *https://jspp.psychopen.eu/article/view/96/37doi:10.5964/jspp.v1i1.96.*

29. B.K.Ravi, "New Media Culture and Society" in *Academic Research International*, Bangalore: Department of Communication Bangalore University, 2012, Vol. 2, No. 2, *https://core.ac.uk/download/pdf/72802219.pdf.*

30. Kurt Lang & Glady Engel Lang, "Mass Media And Voting", In *Readers In*

public Opinion And Communication, Morris Janowitz and Paul M. Hirsch (Eds.)New York, Free Press, (1966), 2nd ed, P 336.

31. Diana C. Mutz & Byron Reeves, "The New Videomalaise: Effects of Televised Incivility on Political Trust", In *The American Political Science Review*, Cambridge: Cambridge University Press, 2005, 99(1). *https://www.jstor.org/stable/30038915?seq=1.*
32. Timothy Jay & Kristin Janschewitz, *The Science of Swearing*, Massachusetts: Association for Psychological Science, October, 2012, *https://www.psychologicalscience.org/observer/the-science-of-swearing.*
33. William J. Cromie, "Verbal beatings hurt as much as sexual abuse", In *The Harverd Gazette*, Cambridge, UK., 2007, *https://news.harvard.edu/gazette/story/2007/04/verbal-beatings-hurt-as-much-as-sexual-abuse/.*
34. Diane Howard, Dr. "A Media-Wise Report on Foul Language Movieguide", Camarillo, CA, *The Family Gude to Movie and Entertainment,* (Not mentioned), *https://www.movieguide.org/news-articles/media-wise-report-foul-language.html.*
35. Chandra Johnson. "Kids and swear words: Can profanity in media hurt?, Washington", In *The Washington Times*, LLC, 2014, *https://www.washingtontimes.com/news/2014/aug/20/kids-and-swear-words-can-profanity-in-media-hurt/.*
36. Diane Howard, Dr. "A Media-Wise Report on Foul Language Movieguide", Camarillo, CA, *https://www.movieguide.org/news-articles/media-wise-report-foul-language.html.*
37. Erik Stran, "Does Swearing Corrode Society?", New York, *Psychology Today,* (2004), *https://www.psychologytoday.com/intl/articles/200403/does-swearing-corrode-society.*
38. Diane Howard, Dr."A Media-Wise Report on Foul Language", *ttps://www.movieguide.org/news-articles/media-wise-report-foul-language.html.*
39. Craig A. Anderson & Brad J. Bushman. (2018). "Media Violence and the General Aggression Model", in *Journal of Social Issues*, Medford, , (USA), Society for Psychology and and Study of Social Issues, Volume74, Issue2. *https://spssi.onlinelibrary.wiley.com/doi/full/10.1111/josi.12275.*
40. Diane Howard, Dr. "A Media-Wise Report on Foul Language",

https://www.movieguide.org/news-articles/media-wise-report-foul-language.html.

۴۱ آئی این پی،روزنامہ پاکستان،''چور کو چور نہ کہوں تو کیا امام مسجد کہوں''،مشمولہ روزنامہ پاکستان لاہور، پاکستان پبلشرز،۶/دسمبر۲۰۱۴ء،

https://dailypakistan.com.pk/06-Dec-2014/170117?version=amp۔

۴۲ مظہر برلاس،''مولا جٹ''،مشمولہ روزنامہ جنگ، راول پنڈی، انڈی پینڈنٹ نیوز پیپرز کارپوریشن،،۵/اکتوبر ۲۰۱۸ء،

https://jang.com.pk/news/559568۔

۴۳ طیبہ ضیا،''جو مودی کا یار ہے''،مشمولہ نوائے وقت،راول پنڈی، ادارہ نوائے وقت،۱۰/فروری ۲۰۱۸ء،

https://www.nawaiwaqt.com.pk/10-Feb-2018/767738۔

۴۴ سما، (۲۰۱۸ء)،''استقبال کے لیے جانے والے گدھے ہوں گے''،مشمولہ سما ٹی وی ویب سائٹ، کراچی،جاگ براڈ کاسٹنگ کارپوریشن،۱۲/جولائی ۲۰۱۸ء،

https://www.samaa.tv/urdu/pakistan/2018/07/1195047/۔

۴۵ نذیر کہوٹ،مشمولہ فیس بک،

https://www.facebook.com/photo?fbid=10215467809802316&set=a.3026163587009۔

۴۶ سید فاخر عباس،''گدھے پر نام لکھ کر تشدد کا نشانہ بنا ڈالا''،مشمولہ،اردو پوائنٹ ڈاٹ کام،۱۶/جولائی ۲۰۱۹ء،

https://www.urdupoint.com/daily/livenews/2018-07-16/news-1607846.html۔

۴۷ ویب ڈیسک،جیو نیوز، ایس ایس پی اسلام آباد پر مظاہرین کا حملہ،مشمولہ جیو نیوز، کراچی، انڈی پینڈنٹ نیوز پیپرز کارپوریشن، یکم ستمبر۲۰۱۴ء،

https://urdu.geo.tv/latest/87802۔